دھیرے اُٹھتی تھی اور پانی کم ہوتا تھا۔ ندی کے اونچے کنارے دُور ہوتے جا رہے تھے اور پانی سمٹ رہے تھے۔ بُوٹے کا وجود اب سُکھ چین سے بہتا تھا۔ بُلند کناروں سے پرے چند چھپروں کی ایک بستی تھی اور اُس سمے سُورج ڈوبنے کو تھا۔

پانی کے دو پرندے بہاؤ کے عین اوپر جیسے ٹھہرے ہوئے تھے وُہ تیز آواز میں بولتے جاتے تھے۔

اور بُوٹا اٹکتا ہوا بہتا جا رہا تھا۔

پاروشنی کے پانی میں ڈوبے ہوئے جُتّے کے ساتھ جیسے کوئی سرسراتا سانپ لپٹا اور اُس کی کئی زبانیں اس کے ابھار اور بیچ کو چاٹنے لگیں۔ ایک ڈر کی ہچکی اُس کے مُنہ سے نکلی اور وُہ نوکدار کانوں والے سیاہ بلّے کی طرح ٹھٹکی اور اُس کے تنگے وجود پر خوف سے کانٹے اُبھرے اور وُہ ہڑبڑا کر کھڑی ہو گئی۔ اُس کے ابھاروں پر ٹھہرا پانی دریا میں شَپ شَپ گرا۔ وُہ سرسراتی ہوئی شے اُس کے پیروں میں لوٹ رہی تھی۔ وہ جھکی اور ڈرتے ڈرتے پانی میں پاؤں کے گرد ہاتھ پھیرا۔ صرف ایک ٹہنی تھی، چند پتّے اور چھلی ہوئی اور کئی دن اور کئی رات کے بہاؤ سے بے جان ہوتی ہوئی۔

"سِلما۔۔" پاروشنی کی آنکھیں خوش خوش پھیل گئیں۔ سِلما۔۔۔ اُس نے ادھر کو جدھر سے یہ بُوٹا آیا تھا آنکھیں میچ کر دیکھا، دریا کسی بڑھیا کے سینے کی طرح ہموار تھا۔ پاروشنی نظریں جمائے کھڑی رہی اور دیکھتی رہی اور بہت دیر تک دیکھتی رہی اور تب اُس نے بہت دُور مُٹھی بھر سفید جھاگ کو دیکھا جو ڈولتی ڈولتی اُس کی طرف آ رہی تھی۔ اور اُس کے پیچھے دو مٹھی جھاگ تھی اور اُس کے پیچھے۔۔۔ وہ فوراً نیچے بیٹھی اور کان پانی کے بہاؤ کے ساتھ لگا کر پُورے بدن سے سننے لگی۔ ہاں مدھم سی آواز تھی، دریا بول رہا تھا۔۔۔ بڑے پانی آ رہے تھے۔

وہ ایک سیاہ ہرن کی طرح پانی کو کُود کُود کر پھلانگتی کنارے پر گئی۔ لُنگی کو کولہوں پر پھنسایا، سینے کو ڈھک کر جُھجھر اُٹھائی اور سروٹوں والے راستے پر چلتی ہوئی بستی کی طرف مُنہ کر لیا۔ پانی مٹّی پر اُس کے پاؤں کے نشان بناتا تھا اور وُہ چلتی تھی۔

سمرو نے انگوٹھے اُور اُنگلی میں بھینچے پیپل کے پتّے ایسی شکل کے سفید منکے کو دیکھا جس پر سیاہ دھبّوں کی گول اور ترچھی لکیریں تھیں۔۔۔ یہ منکا میں نے سمرو نے بنایا ہے۔ اُس پتھر

کے ڈھیر میں سے ایک ٹکڑا لینے کے لئے میں نے کتنے دن پسینہ ٹپکایا اور دھوپ میں جسم جلایا جو پکلی کے آوے سے پرے رُکھوں کے قریب کھڑا ہے۔ وہ پتھر کا ڈھیر وہاں نہ ہوتا تو میں کیا کرتا۔ میں یہ ٹکڑا وہاں سے توڑ کر لایا اور پھر اسے آری سے کاٹا، تیز دھار سے اس کی شکل بنائی، کُھرچنے سے اِسے رگڑا۔ پھر اِسے کھار میں ڈبو کر گرم کیا تو یہ سفید ہوا۔ اور اس کی سفیدی پر میں نے کتنے سانس روک کر سوئی کی مدد سے آگ پانی کے ساتھ سیاہ شکلیں بنائیں۔ یہ کس کی شکلیں ہیں۔ یہ کیا صُورتیں ہیں جو میں اِن پتھر۔ مٹّی اور سونے چاندی کے منکوں اور چوکور مُہروں پر بناتا ہوں۔ یہ کہاں سے آتی ہیں۔ یہی شکلیں، یہی مُورتیں اس بستی میں کب سے بنتی آئی ہیں، جب سے میں ہوں جب سے میرا بیج اس زمین میں اُگا۔ لیکن میرا بیج سب سے پہلے پہل اس زمین میں کس نے اُگایا۔ پہلا کون تھا۔ اُسے کون لایا۔ اُسے یہ مُورتیں کس نے سکھائیں۔ نانکو نے؟ کس نے؟ اور جب میرے اندر کا سانس ہمیش کے لئے باہر جاکر دریا پار ہو گا اور میں ٹھنڈا ہو جاؤں گا اور مجھے بھی ایک مرتبان میں ڈال کر زمین میں رکھ آئیں گے تو پھر یہ شکلیں اور مُورتیں کوئی اور بنائے گا۔ کب تگ۔ کب تک۔ یہ منکا اِس بستی میں رہے گا، پھر کہاں جائے گا، میری طرح مٹّی میں؟ اور پھر بے اَنت رات دن بعد جب سُورج تو ہو گا، یہ دریا بھی ہو گا، بستی بھی شائد ہو تو ہو سکتا ہے کوئی بڑے پانی آنے سے پہلے اپنی زمین کھودے تو نیچے میری طرح دبا ہوا یہ منکا اُسے ملے۔ وُہ کیسا ہو گا جسے یہ منکا ملے گا میرے جیسا یا کوئی اور۔ اور وہ کیسے جانے گا کہ منکا جس پر میں نے اتنے پسینے بہائے ہیں اور دُھوپ جلاہوں میں نے بنایا ہے، سمرو نے بنایا ہے۔

سمرو نے پتھر کے ایک ٹکڑے کو آگ پانی میں ڈبویا اور منکے کے ایک کونے میں ایک شکل بنادی۔ اب جو کوئی بھی دیکھے گا وُہ جان جائے گا کہ یہ سمرو لکھا ہے اور اُسی نے یہ منکا بنایا ہے۔

پاروشنی مگن چلتی تھی اور سُورج ڈوبنے کو تھا اور سمرو کی آنکھوں نے اُسے دیکھا۔ یہ رُکے گی۔ وُہ جھجھر کُولہے پر اٹکائے چلتی رہی، رُکی نہیں۔

"ہے پاروشنی۔" سمرو نے ہیک لگائی "رُک۔۔۔ تیرے پیچھے تو جیسے بڑے پانی آتے ہیں ایسے چلتی ہے"۔

پاروشنی رُکی۔۔

سمرو اُسے دیکھ رہا تھا۔ اُس کا چہرہ پاروشنی کا، ڈوبو پانی ایسا تھا۔ اوپر سے ہموار اور نیچے

سے گہرا اور ڈوبو۔۔ پتہ نہیں اُس کی گہرائی میں کیا تھا۔ وہ اُس کے پاس ہوئی اور جھجھر رکھنے کے بعد لونگی کو گھٹنوں پر کھینچتی ہوئی بیٹھ گئی۔ اُس کے لیڑے ابھی تک خشک نہیں ہوئے تھے اور جس جگہ وُہ بیٹھی تھی گیلی ہونے لگی۔

"میرا جی کہتا ہے کہ میں بھی کھیت کا کام کرتا۔ اب تک کھود کے بیج ڈال اپنے جُتّے کو ڈھیل دیتا اور چین سے کام کاج کے بغیر رہتا تیری طرح۔۔"

"جو کام تو کرتا ہے وہ ہم میں سے کون ہے جو کر سکتا ہے۔" پاروشنی مدھم ہو کر بولی۔

"پر اس بار تو دیر ہو رہی ہے۔ پانی نہ برسا ہے اور نہ اُدھر سے آیا ہے۔" سمرو نے دریا کو وہاں تک دیکھا جہاں تک دیکھ سکتا تھا "بڑے پانی نہ آئے تو کیا ہو گا"؟

"پتہ نہیں۔" پاروشنی بولی۔

"پر اُس نے تو آنا ہے۔۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوا کہ نہ آئے"

"نہیں ایسا کبھی نہیں ہوا"

اور تب سمرو نے دیکھا کہ اُس کی مٹھی ایک گیلی اور چھلی ہوئی ٹہنی پر بند ہے جسے وُہ کُچھ چُھپا کر پیٹھ پیچھے رکھتی ہے "یہ بُوٹا کیسا ہے؟"

"پکلی کے لئے ہے" وُہ شتابی سے کہنے لگی "مُورتیں اُلیکنے کے لئے ٹہنی ہے"

بڑے پانی ایسے نہیں تھے کہ کسی کو سُن گُن ہو، پتہ چلے کہ آ رہے ہیں اور وہ دوسروں کو بتاتا پھرے، بستی میں بولتا پھرے۔۔ اس طرح تو وہ واپس چلے جاتے ہیں۔ ایسا ہی ہوتا تھا۔ جسے بھی پتہ لگتا تھا وُہ چُپ رہتا تھا۔ اور جب وُہ آتے تھے اور کناروں سے نکل کر کھیتوں کو بہتے تھے تب سبھی کو آپو آپ پتہ چل جاتا تھا اور پھر بستی میں کوئی ایک کہتا تھا کہ اس بار سب سے پہلے میں نے جانا کہ یہ آ رہے ہیں پر میں چُپ رہا۔ اور اس بار پاروشنی کی باری آ گئی تھی، اُس نے تب تک ہیں بولنا تھا۔

"پانی کا بُوٹا ہے؟" سمرو نے آگے ہو کر پھر پُوچھا۔

"نہیں۔" پاروشنی اُٹھنے لگی۔

"ورچن پتہ نہیں آئے کہ نہ آئے"

پاروشنی بیٹھ گئی۔

"یہ منکا میں نے ابھی بنایا ہے۔ تجھے چاہیئے تو رکھ لے"

پاروشنی نے کچی دیواروں اور سروٹ کی چھت والے اُس چھپر کو دیکھا جو سمرو کا گھر تھا اور کام کاج کا ٹھکانہ بھی۔ وہ صرف منکے اور موتی نہیں بناتا تھا بلکہ مُہریں بھی گھڑتا تھا اور دریا کی سیپیوں پر بیل بُوٹے بھی کھودتا تھا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ کسی دُور کی بستی سے کوئی عورت آئی جو ہنستی بہت تھی اور وُہ ادھر آئی اور آ کر کہنے لگی کہ سمرو کہاں ہے؟ کون ہے؟ میں اُس سے سیپیوں کے گہنے لُوں گی۔ ہاں سمرو جیسا بستی میں اور کوئی نہ تھا۔ اُس کی مُہروں پر پرندے، ہرن اور دریا کے جنور جیسے کروٹیں لیتے اور اُڈاریاں مارتے تھے، وہ سچ مچ کے دِکھتے تھے۔ بستی کے لوگ اِن مُہروں کو بازؤوں پر باندھتے اور اپنے چھپروں کی دیواروں کے ساتھ لگا کر دیکھتے۔

وُہ کھیتی کرنے کے لئے پتھر سے کُدالیں اور کسیاں بھی بنا لیتا تھا۔

سمرو کی ہتھیلی اُس کے سامنے کھُلی تھی اور اُس پر وُہ سفید منکا دھرا تھا جس پر سیاہ دھبوں کی گول اور ترچھی لکیریں تھیں۔ "رکھ لے" سمرو نے پھر کہا۔

"فصل پکنے پر میں خود لے لوں گی۔۔" وہ بولی۔

"فصل تو پک گئی۔۔" سمرو نے کہا اور اُس کا چہرہ بھی ڈوبُوپانی ایسا ہی ہونے لگا، اُوپر سے سُکھ چین اور نیچے پتہ نہیں یَم کے کُتّے مُنہ کھولے ہوئے۔ سمرو ہمیشہ عجیب عجیب باتیں کرتا تھا، وہ کہتا کچھ تھا اور اُس کے اندر کچھ اور ہوتا تھا۔ اور یہ کچھ اور اُس کے چہرے پر ہوتا تھا اور یُوں پاروشنی اُسے سُنتی کم تھی پر دیکھتی زیادہ تھی۔ اُسے وُہ اتنا ہی اچھا دِکھتا تھا جتنا کہ ورچن۔۔ اُس کے بیچ میں گرمی اور نمی دونوں کے دیکھے سے آتی تھی۔

"تُو ورچن کے لئے دن گزارتی ہے اور رات سوتی ہے پر وُہ بھی تو میں ہوں"

"ہاں تم وُہی تو ہو۔۔۔ پر وُہ آجائے تو"

"پینڈا بہت بڑا ہے پاروشنی۔ پہلے تو اُسے گھاگرا کے ساتھ ساتھ ششُدری دریا تک جانا تھا اور پھر جہاں یہ ملاپ کرتے ہیں وہاں سے ششُدری کے دوسرے پاسے جا کر سندھو کی طرف اور موہن جوڈورو۔۔ واپسی پر شائد وُہ ہری یوپیا بھی جائے"

"یہ بہت بڑی بستیاں ہیں، ہری یوپیا اور موہن جوڈورو۔۔"

"ہاں۔"

"کتنی بڑی؟"

سمرو نے پہلی بار اپنے موٹے ہونٹوں کو ڈھیل دی تو اُس کے دانت لِشکے "میں تو گیا نہیں پر وُہ ضرور ہم سے بہت بڑی بستیاں ہیں اور بُہت دور ہیں۔ اور میں جاؤں گا بھی نہیں۔ جو بُوٹا

اُکھڑ گیا وہ سُوکھ گیا۔ میری ہریالی۔ یہیں پر ہے۔۔"

"اور ورچن۔۔"

"وہ تو لوٹے گا۔ اُس کے اندر امن نہیں۔ وُہ ایک جگہ رہے تب سُوکھتا ہے۔۔"

"لیکن سمرو تو نے اُسے بھیجا تھا، تُو نے آپ۔"

"نہ۔۔۔ نہ۔۔" سمرو مسکرایا سر ہلاتا ہوا "میرا تو بہانہ تھا۔ میں تیرے لئے وہاں سے ایسی چیزیں لاؤں گا جن سے منکے اور مُہریں ایسے بنائے گا جیسے کبھی نہ بنائے ہوں۔۔ میرا تو بہانہ تھا۔ کہتا تھا کہ سمرو میں تیری مُہریں اور سیپیاں اُدھر کو لے کر جاتا ہوں اور اُنہیں بتاتا ہوں کہ ہمارے پاس تُو ہے۔۔۔ اور ایک پوٹلی بھر کرلے گیا۔۔"

"ہماری بستی کا کوئی نام کیوں نہیں؟" پاروشنی شائد کہیں اور تھی۔

"جہاں بھانت بھانت کے لوگ ہوں۔ اندر کے، باہر کے اور جہاں امن نہ ہو وہاں نام رکھتے ہیں۔ اور جہاں لوگ بستی نہ ہوں وُہ نام رکھتے ہیں۔ ہم تو خود بستی ہیں۔ ہم یہاں نہ ہوں تو وہاں ہوں تو وہاں بستی ہوگی، تو نام کیوں رکھیں۔۔"

"اور یہ بستیاں بڑی کیسے بن جاتی ہیں"

"اِنہیں ہم بڑا بناتے ہیں، چھوٹی بستیوں والے۔۔ ہم نے گھاگرا کے کنارے پر جو کُچھ بنایا اُنہوں نے اِس کی سُن گُن پاکر وہاں یہی کُچھ بڑا کر کے بنا دیا۔ یہ چوکور مُہریں۔۔ وُہ کہاں بناتے تھے، ادھر گھاگرا کی بستیوں کے میرے جیسے وہاں گئے تو اُن کو سکھایا۔ یہ برتن اور کھیتی کرنے کے ڈھنگ ادھر سے گئے۔۔ بیج یہاں کا تھا اور پُھوٹا وہاں جاکر اور رُکھ اُن کے سروں پر چھایا بنا۔۔ پر اُن بستیوں والے ہم جیسے نہیں پاروشنی۔ سندھو میں بڑی بڑی کشتیاں تیرتی آتی ہیں بہت دُور کی بستیوں سے۔ جدھر سُورج ڈوبنے کو جاتا ہے اُدھر کے لوگ وہاں آتے ہیں اور موہنجو والے ایسی چیزیں پاس رکھتے ہیں جنہیں ہم نہیں جانتے"

"اور اگر ہم نہیں جانتے تو کیا ہے۔۔" پاروشنی یکدم بپھر گئی "جو کُچھ یہاں ہے، ہمارے پانیوں، کھیتوں اور رُکھوں میں ان کے سوا میرا جُثہ تو اور کچھ نہیں مانگتا۔ کیا سب کچھ جاننا ضروری ہے؟ جتنا جانو گے اتنا اکھڑو گے۔ میں بھی اِس بستی سے پَرے کبھی نہیں ہوئی اور نہ کبھی ہوں گی۔ میرے گھر میں جو کُنواں ہے اُس کُنویں سے میٹھے اور ٹھنڈے پانی اور کہاں ہوں گے سمرو۔"

"ہوں بھی تو وُہ ہمیں میٹھے نہیں لگیں گے۔۔" سمرو نے ہڈیوں کے ٹکڑوں، پتھروں اور

مٹّی کے ڈھیلوں میں سے ایک اور منکا اٹھایا اور اُسے وہاں رکھ دیا جہاں پاروشنی کی بھاری پیٹھ پر کسی لنگی میں سے پانی ٹپک ٹپک کر زمین میں بیٹھتا جاتا تھا۔ منکے نے ایک پیاسی زبان کی طرح نمی کو چوسا اور اُس کا رنگ دھیرے دھیرے سُرخ ہونے لگا۔

"یہ کیا کرتا ہے؟" پاروشنی ڈری اور کھڑی ہو گئی۔

"سمرو نے منکا اُٹھالیا" بہت دن ہوئے، اتنے دن کہ ابھی تو بھی نہیں تھی اور میں بھی نہیں تھا تو ادھر بیلوں پر سوار کچھ لوگ آئے تھے جن کے پاس ایسی چیزیں تھیں جو ہم نہیں جانتے۔ میری میّا نے سُرخ سالو دے کر اُن سے یہ منکا لیا تھا۔ پانی میں ڈالنے سے رنگ بدلتا ہے"۔

"تو اِسے پرے رکھ میرے پاس نہ لا۔۔"

سمرو نے اُسے پرے رکھ دیا اور اُس منکے کو اُٹھایا جس پر وُہ کام کر رہا تھا" پر یہ والا تو میں نے خود بنایا ہے۔۔ یہ رکھ لے"

"فصل پکے گی تو رکھ لوں گی۔۔"

"نہیں اس کے لئے مجھے تیری ٹوپا بھر کنک نہیں چاہئیے۔ یہ تُو ویسے رکھ لے۔ بازو پر باندھ لے ڈھولی کے طور پر۔۔ پر باندھوں گا میں۔۔"

پاروشنی نے اُس کا زور والا سیاہ ہاتھ اپنے بازو کی طرف بڑھتے دیکھا تو اُس کی آنکھوں میں پُورے بدن کے ڈھے جانے کا سندیسہ سیاہ ہوا۔ سمرو نے سلما کے ریشوں سے بٹی ہوئی رسّی کے ساتھ منکا اُس کے بازو پر کس دیا" ورچن آجائے گا۔" سمرو مسکرایا۔

"میں جاتی ہوں۔" وہ منکے پر ہتھیلی رکھ کر بولی، رسّی ماس میں کُھب رہی تھی۔

"پتہ نہیں بڑے پانی کب آئیں گے۔" سمرو پاروشنی سے پرے دریا کے بہاؤ پر تھا۔

"پتہ نہیں۔"

وُہ جانے لگی تو رُکی "سمرو تو اب بھی سوتے میں چلتا ہے، دیکھتا ہے؟"

سمرو کا چہرہ پھر سے ڈوبو پانی کی طرح سلوٹوں کے بغیر پدھرا ہو گیا "ہاں۔۔ پر سچ مُچ تو نہیں چلتا۔ لیکن سچ مُچ دیکھتا ہوں بہت کچھ۔۔"

"اِس رات کیا دیکھا؟"

"اِس رات تو کچھ نہیں دیکھا۔ نیند میں ایسا ڈوبا ایسا ڈوبا کہ سویرے باہر آیا۔ جو کُچھ دیکھتا ہوں تجھے بتا دیتا ہوں"

پاروشنی مُڑی اور اُس کی پیٹھ سمرو کی طرف تھی۔

"ٹھہر۔۔" سمرو نے اپنے آپ میں گم ہوتے ہوئے کہا۔ پاروشنی رُکی، وُہ جانتی تھی کہ اب سمرو وُہ کہے گا جو کوئی اور نہیں کہتا۔ سمرو نے آنکھیں جُھکا کر زمین کو دیکھا جیسے وہاں سے کچھ جان رہا ہو اور کہنے لگا" جیسے ایک سفید سانپ جنگل کے جانور پر حملہ کرتا ہے ایسے اُس نے جس کے دانت سفید کونپلوں کی طرح لشکتے ہیں اور اُس کی کُہنیوں میں چُوڑیاں ہیں اور کنگن ہیں اُس نے مُجھ پر وار کیا ہے۔۔"

پاروشنی کے ہونٹ کُھلے اور اُس کے دانت سفید کونپل ہوئے۔ اُس نے مُڑ کر سمرو کو دیکھا نہیں اور باہر راستے پر آگئی۔ وُہ ماتی کے پُتروں کی گڈ کے نشانوں پر پاؤں دھرتی چلنے لگی۔ سمرو منکوں اور مُہروں پر شکلیں بناتے ہوئے گم ہوتا تھا اور ایسی عجیب عجیب باتیں سوچتا تھا اور پھر پاروشنی سے کہتا تھا۔ اور اُسے یہ باتیں بھلی لگتی تھیں۔

بستی پاروشنی کے قریب آتی گئی، پہلے چھپر کی کچّی دیوار کے ساتھ لیٹے تین کُتّوں نے آہٹ سُن کر کان کھڑے کئے، گلے میں سے خُر خُر کی آوازیں نکالنے کا ارادہ کیا، دُمیں زمین پر پٹخیں، اگلی دونوں ٹانگوں پر اپنے آپ کو سیدھا کیا اور پھر اُس کی باس کو اپنا جان کر پھر سے لیٹ گئے۔

آج دوپہر پرندے کی سُرخ سُوکھتی آنکھوں نے اسی بستی کو دیکھا تھا اور دیکھا تھا کہ دریا کے ساتھ سیدھی دیواروں اور پدھری چھتّوں کے چند چھپّر ہیں جن میں دو بڑی گلیاں پہاڑ پاسے سے سیدھی جاتی تھیں اور ان چھپروں کے پیچھے دو چھوٹی اور تنگ گلیاں ہیں اور وُہ بھی سیدھی ہیں جیسے کسی بچّے نے کھریا مٹّی سے سیدھی لکیریں کھینچ دی ہوں۔ اِن گلیوں کے بیچ میں پکّی اینٹوں کی نالیاں تھیں پر گھروں اور گلیوں کا رنگ مٹّی تھا جو ہر طرف اُڑتی تھی اور پاروشنی اس مٹّی پر پاؤں دھرتی ایک تنگ گلی میں داخل ہوئی۔ گھروں اور گلیوں کا رنگ مٹّی تھا صرف اس لئے کہ اب کے پانی برسے دیر ہو گئی تھی۔ گھاگرا کنارے اس بستی کے لوگ ویسے ہی تھے جیسے اس کے کناروں پر کھڑی اُن بستیوں کے تھے جدھر سے پانی نیچے آتے تھے۔ اُن بستیوں میں سے سُوتھی، بنجور اور مِسوال کے نام لوگوں نے سُن رکھے تھے پر کوئی بھی آج تک اُدھر گیا نہیں تھا اور نہ ہی کوئی ادھر سے کبھی آیا تھا۔ ان مین سے ایک بستی کا نام ویارنا سُنا گیا تھا جو سندھو کے موہنجوڈارو اور پاروشنی کنارے کے ہری یوپیا جتنی ہی تھی اگر اُن سے بڑی نہیں تھی۔ یہ بھی سُنا تھا کہ وُہ لوگ بھی اس بستی کی طرح بڑے پانی آنے سے پہلے پہلے کھیت کھود کر اُن میں کنک، مٹری اور کُسنبے وغیرہ کے بیج ڈالتے تھے اور جب بڑے پانی اُن کے کھیتوں پر چل کر واپس دریا کو جاتے تھے تو اُن کی چھوڑی ہوئی سیاہ مٹّی کی تہہ بیجوں کو گرمی دیتی تھی اور وتر آنے پر وُہ چاند چکر سے

پہلے پُھوٹ پڑتے تھے۔ اور جب پانچ سے سات چاند چکرّ پُورے ہوتے تھے تو کُسنبہ تیار ہو جاتا تھا جو جنوروں کے کام آتا تھا۔ چھٹے چکرّ کے بعد کنک میں دانہ پڑتا اور ساتویں پر اُسے کاٹ لیتے تھے۔ اُس کے فوراً بعد باجرے کا سخت جان بیج لگاتے تھے جس پر سے اگر بڑے پانی گزر جائیں یا اُس پر ٹھہر جائیں تو بھی وُہ گلتا سڑتا نہیں زندہ رہتا ہے۔ کُسنبے کے کیسری رنگ کے ساتھ وُہ سالُو اور سُلاریاں رنگتے جو بیاہ پر لڑکی کمر کے ساتھ یُوں باندھتی کہ اُس پر سُرخ دھبّے نظر نہ آتے۔ بستی کے سارے کھیت سانجھے تھے اور چھپرا اپنے اپنے تھے جو عورت ذات کے ہوتے تھے۔ دریا میں سُروٹوں سے بنائے ہوئے تُلّے تھے جو بے حد ہلکے تھے اور جس کا جی چاہے وُہ ان پر بیٹھ کر دریا کے بیچ جا کر مچھلی پکڑ سکتا تھا پر بستی کے لوگ مچھلی پکڑنے والوں کو اچھا نہیں جانتے تھے۔ بستی کے ہر باسی کے ذمّے کوئی نہ کوئی ایسا کام ہوتا تھا جس کا فائدہ سانجھا ہوتا تھا۔ اس بستی میں تانبے کو پگھلانے کی کوئی بھٹّی نہ تھی اور جب کبھی وہاں سے بیلوں پر سوار پھیرے والے گزرتے وُہ اِنہیں یہ دھات دیتے اور ان سے کھانے پینے کو کچھ لے لیتے۔ بستی سے باہر پکلی کے آوے سے پرے وہ میدان تھا جس میں مرے ہوؤں کے برتن تھے۔ ساتھ میں چھوٹے چھوٹے پتھروں کا ایک راستہ تھا۔ جس کا جو کوئی بھی ٹھنڈا ہو کر ہمیشہ کے لئے دریا کے پار چلا جاتا وُہ اُسے مٹّی میں رکھنے کے بعد اُس راستے پر ایک اور پتھر رکھ کر گھر لوٹتا۔ راستے کے سارے پتھر اتنے تھے جتنے اس بستی میں آکر جانے والے تھے۔ بستی کے شروع میں لِنگ کا ٹیلا تھا، یہیں دریا کے ساتھ بھکشو ٹیلا بھی تھا جو اپنی جگہ بدلتا رہتا۔ مٹّی اور ریت کا یہ ڈھیر سُست کچھوے کی طرح ہوا کے راستے میں پڑا سرسراتا رہتا، آلتی پالتی مارے بیٹھا رہتا۔ پھر بڑے پانی کے بعد ہوائیں چلتیں اور دھیرے دھیرے اُس کی مٹّی اور ریت اٹھاتی رہتیں اور اُنہیں راستے کے دوسری طرف ڈالتی رہتیں اور یُوں کچھ دنوں میں پورا ٹیلا جگہ بدل لیتا، تبھی اِسے بھکشو ٹیلا کہتے تھے، ایک جگہ سے اُٹھتا تھا اور دوسری جگہ جا بیٹھتا تھا۔ اور اگلی رُت میں وُہ پھر وُہیں واپس آ بیٹھتا۔ اِس اُٹھک بیٹھک میں اُس کی مٹّی اور ریت گھٹتی بڑھتی نہیں تھی، اتنی ہی رہتی تھی۔ لِنگ کے ٹیلے پر سرسوں کا تیل اور گیندے کے پُھول پڑے رہتے تھے۔ جس کسی نے یہاں آنا ہوتا تھا وہ رات کو آتا تھا اور چڑھاوا چڑھا کر چُپکے سے چلا جاتا تھا۔ بستی والے صرف ایک دوسرے کے ساتھ ہی نہیں بلکہ رُکھوں اور جنوروں سے بھی باتیں کرتے تھے کیونکہ اُن میں بھی تو وہ سانس ہوتا تھا جو انانکو نے سب میں پھونکا تھا۔ اور پانی تو خود بولتے تھے پر اُن کی بولی سب نہیں صرف لِنگ ٹیلے کے قریب آلکس سے لیٹا گیرو ہی سمجھتا تھا۔ جب کبھی بڑے پانیوں کے آنے میں دیری

ہوتی تو بستی والے ایک چنگیر میں مچھلی اور گیندے کے پھول لے کر اُس کے پاس جاتے اور وُہ مچھلی کھا کر اور پھول سونگھتے ہوئے دریا میں اُترتا اور پانیوں پر مُنہ رکھ کر کچھ کہتا اور پھر کان لگا کر سنتا اور واپس آکر بتاتا کہ پانیوں نے یہ کہا ہے۔ پر بستی کے سارے لوگ اُس کی باتوں کو مانتے نہیں تھے، وُہ یہ سب کچھ صرف اس لئے کرتے کہ اُن سے پہلے یہی کچھ ہوتا چلا آیا تھا۔ دوسری بستیوں کے بارے میں اُنہوں نے یہ بھی سُنا تھا کہ اُن کے آس پاس کھیت کم ہو رہے ہیں اور ریت آگے آرہی ہے اور اُن کھیتوں سے پرے کوئی رُکھ نہ تھے۔ اسی لئے اُنہیں سُوکھتی جھیل کے گرد اور ڈوبو مٹّی کے ساتھ پھیلے گھنے رُکھوں کا بڑا خیال تھا۔ اُنہیں یہ بات بھلی لگتی کہ اُن کے جنگل میں ایسے ایسے جنور تھے جو کسی نے کہاں دیکھے ہوں گے۔ ہرنوں، نیولوں اور سیہوں وغیرہ کے علاوہ وہاں منہ زور بھینسے اور بھینسیں بھی تھیں مگر اُن کے قریب جانے والے کم ہی بستی کو لوٹتے تھے۔ اور یہ جنور بھی بستی سے دُور ہی رہتے تھے کیونکہ درمیان میں ڈوبو مٹّی تھی جو اُن کے بھاری جُثّے کو سہار نہیں سکتی تھی اور اُنہیں اپنے اندر گُم کر لیتی تھی۔ ایک بار ورچن اور سمرو نے ڈوبو مٹّی میں پھنسی ایک بھینس کو وہاں سے نکال لیا تھا اور بستی میں لے آئے تھے۔ پر اُسے نکالنے سے پہلے اُنہوں نے اُس کا گلا تیز پتھر سے کاٹ لیا تھا۔ انہی رکھوں کے اندر ایسا گُمار رہتا تھا کہ اُن کے اندر جانے سے بدن پسینے میں بھیگتا تھا اور یہیں پر پاروشنی تھی۔

گھروں اور گلیوں کا رنگ مٹّی تھا جو ہر طرف اڑتی تھی اور پاروشنی اِسی مٹّی پر پاؤں دھرتی ایک تنگ گلی میں داخل ہوئی اور یہیں پر اُس کا گھر تھا، اُس کا چھپّر تھا۔ باہر سے لگتا کہ بس کچّی دیواریں ہیں اور ان کو ڈھک دیا گیا ہے۔ بڑے بوڑھوں نے کہا تھا کہ گھر کو نظر اور سُورج سے بچاؤ اور اسی لئے روشنی کا ایک چوکور سوراخ تھا اور یا پھر اندر جانے کو ایک چھوٹا سا راستہ۔ پاروشنی ایسے راستے سے پہلے چھوٹے کمرے میں آئی۔ اُس کا گھر بھی بستی کے دوسرے گھروں کی طرح سروٹ اور گارے سے بنا تھا لیکن ایک فرق تھا۔ اُس نے دیواریں کھڑی کرنے سے پہلے پکّی سے پکّی ٹھیکریاں لے کر گارے میں ملا دی تھیں۔ یُوں جب مینہ برستا تو دیواریں کھڑی رہتیں اور تھوڑی بہت مٹّی گُھل جاتی۔ چھوٹے کمرے کے ساتھ ایک راہداری تھی جو پانی کے کمرے میں جاتی تھی اور وہاں کنواں تھا۔ پاروشنی اپنے اسی کنویں کے پانی کو ہر سویر چکھتی اور پھر بڑی جھجھر میں بھر کر بستی کے سارے چھپروں میں باری باری آتی جاتی اور وہاں مٹّی سے بنی ہوئی گڑاونی پر رکھے گھڑوں اور جھجھروں میں ڈالتی۔ اور وہاں چھپر بھی بس اتنے ہی تھے جتنی ہاتھ پاؤں کی اُنگلیاں ہوتی ہیں۔ پاروشنی پانی یُوں بھرتی کہ یہ کام اُسی کا تھا۔ جیسے بستی کے دوسرے باسی ایک

دوسرے کے لئے کام کرتے تھے ایسے پاروشنی کے حصّے میں جھجھروں اور گھڑوں کو بھرے رکھنا تھا۔ کنویں والے کمرے کے کونے میں پکّی اینٹوں کا کُھرا تھا نہانے دھونے کو اور اُس کے ساتھ بدن سے پھوک نکالنے کو مٹّی کی ایک بیٹھک تھی۔ کُھرے اور بیٹھک میں سے پانی اور پھوک کو نکالنے کے لئے سُرخ مٹّی کی ایک گول نالی تھی جو بڑی گلی میں زمین کے نیچے بنے ہوئے ایک گڑھے میں جاتی تھی۔

کنویں والے کمرے میں صرف راہداری آتی تھی اور اُس میں روشنی کے لئے کوئی سوراخ نہ تھا اور یہاں پہنچ کر پاروشنی کی آنکھیں دیر تک دیکھتی رہیں اور تب جا کر نیم سیاہی میں اُنہیں منڈیر پر رکھا بوکا اور اُس سے بندھی ہوئی سلما کی رسّی دکھائی دی۔ پاروشنی کے بدن کے روئیں پانی کی نزدیکی کو سُونگھتے تھے۔ اُس کا سارا جُثہ تھر تھرایا۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے بوکا اٹھایا تو جان لیا کہ اُس میں پانی ہے اور وُہ ہمیشہ اس کمرے سے جانے سے پہلے ایک بوکا نکال کر منڈیر پر رکھتی تھی۔ اُس کے ہاتھ اوپر ہوئے اور اُس نے بوکا مُنہ سے لگایا اور ٹھنڈا پانی کچھ تو اُس کے گلے میں بہا اور زیادہ اُس کی وراچھوں سے نکل کر اُس کی چھاتیوں کو ٹھنڈا کرتا فرش پر گرا۔ اُس نے سویر سے کچھ نہیں کھایا تھا اور جہاں پانی نے اُسے ٹھنڈک دی وہاں اُسے پیٹ کے خالی ہونے کا احساس بھی ہوا۔ اُسے شام کے لئے کچھ اَن پانی کرنا تھا۔

وہ چھوٹے کمرے میں واپس ہوئی جہاں ایک کونے میں کنک سے بھری ہوئی کلھوٹی تھی۔ اُس نے کلھوٹی میں ہاتھ ڈالا تو اُس کی اُنگلیاں کنک پر رکھی پتھر کی ٹوپی پر ٹھہر گئیں جو کنک کے ماپنے کے کام آتی تھی۔ اُس نے یہاں سے ٹوپی بھر کنک نکالی اور پھر دونوں کمروں کے درمیان میں اُس کھلی جگہ پر آ گئی جہاں سے اُسے آسمان دکھائی دیتا تھا۔

اُس نے اوپر دیکھا، شائد وہ جو مرنے کے لئے آیا تھا اُس نے بھی اوپر سے میرے چھپر کو دیکھا تھا۔ اِس ویہڑے کے آدھے حصّے پر چھاؤں کے لئے چھپر پڑا ہوا تھا اور دوسرے حصّے میں ایک جانب ایک بڑے پاٹوں والی چکّی تھی اور اُس کے ساتھ ایک اوکھلی تھی جس کے کونے میں مونگلی دھری تھی۔ یُوں تو سب لوگ ایک بار ہی کئی دنوں کے لئے آٹا پیس کر رکھ لیتے تھے لیکن پاروشنی اس بارے بڑی وہمی تھی، وہ اپنے کھانے کو ہر روز آٹا پیستی اور کہتی کہ پرانے آٹے کی روٹی کا سواد تو جنوروں کے لئے ہے اور ویسے بھی جن دنوں بڑے پانیوں نے آنا ہوتا ہے اُن دنوں آٹے میں سُسری اور کیڑا بننے لگتا ہے۔ پہلے تو وہ چکّی کی طرف گئی لیکن پھر کچھ سوچ کر اُس نے اوکھلی میں پھونک مار کر کنک اُس میں اُنڈیل دی۔ کبھی کبھار جب وہ باریک آٹے کی روٹی

بنانا چاہتی تھی تو وُہ چکّی کو چھوڑ کر اُسے اوکھلی میں جی بھر کے کُوٹ لیتی۔ پر یہ صرف اُن دنوں میں ہوتا جب وہ رُکھوں کی طرف جاتی، جھیل سے ہو کر آتی، اُن دنوں اُس کے اندر چین کم ہوتا اور اُس کے بازو اور ٹانگیں جیسے پتھرانے لگتے اور تب وُہ اوکھلی میں کنک ڈال کر اُسے مونگلی سے خوب کُوٹتی اور ہلکی ہو جاتی۔ آج بھی اُس نے کونے میں دھری لکڑی کی مونگلی کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر اوپر اٹھایا تاکہ کنک کُوٹ سکے پر سینے پر بندھے اُس کے لیڑے کی پکڑ نے اُس کا سانس روکا۔ اُس نے مونگلی نیچے رکھی اور اپنے آپ کو سینے کے لیڑے اور لنگی سے الگ کر لیا۔ یوں اُس کا سانس اور جُثہ دونوں آزاد ہوئے۔ اُس نے مونگلی اُٹھا کر سر کے اوپر تک اُٹھائی اور پھر پُورے زور سے اوکھلی میں پڑی کنک پر دے ماری۔ کنک کے چند دانے اوکھلی میں سے نکل کر اُس کی ٹانگوں پر تیز کانٹوں کی طرح آ لگے۔

وُہ مونگلی کو ایک خاص ٹھہراؤ کے بعد اٹھاتی، اُسے سر سے اوپر لے جانے کے دوران ایک گہرا سانس اندر کو کھینچتی اور پھر اُسے نیچے لاتے ہوئے مُنہ سے سانس نکالتی ہوئی ایک لمبی "ہوؤ" کرتی کنک پر دے مارتی۔ مونگلی کنک پر پڑتی تو ایک گہری "دھم۔۔" کی آواز پیدا ہوتی۔ اور یوں مونگلی کی۔ دھَم۔ اور اُس کے سانس کی۔۔ ہوؤ۔۔ مل کر ایک ایسی سُر بناتے جو بستی سے باہر ہو کر رُکھوں تک پہنچتی اور بتاتی کہ یہ پاروشنی ہے جو شام کی روٹی کے لئے کنک کوٹتی ہے۔ ہاں اس میں اِس۔۔ ہوؤ۔۔ دَھم۔ میں ایک اور آواز بھی تھی جو باہر نہیں جاتی تھی صرف اندر سنائی دیتی تھی اور یہ کھنک تھی اُس کی کُہنیوں تک چڑھے ہوئے کنگنوں کی۔۔ وہ مونگلی اٹھاتی تو کنگن کھَن، کھَن کُہنیوں پر گرتے اور اُسے کنک پر مارتی تو کلائیوں پر اُن کا بھار گرنے لگتا، ان کی کھنک اُسے پریشان کرتی تھی۔

تھوڑی دیر بعد اُس نے آدھے کنگن اتار دیئے، کھنک کم تو ہوئی پر ابھی تھی۔

ہوؤ۔۔۔ دَھم۔۔ ہوؤ۔۔ دَھم۔۔

وُہ گھاگرا کی بیٹی تھی اور اُسے ماتی نے پالا تھا۔ اُسے پتہ نہیں تھا پر اُس نے سُن رکھا تھا کہ ایسا ہے۔ ماتی کا گھر والا جب پانیوں کے پار ہوا اور یَم کے کُتّے اُسے اُٹھا لے گئے تو ماتی پانیوں سے باتیں کرنے کے لئے سات دن اور سات رات گھاگرا کے کنارے بیٹھی رہی اور ساتویں رات اُس نے سروٹوں میں ایک بچّے کے رونے کی آواز سُنی۔ وُہ اُسے اٹھا کر گھر لے آئی اور کہا کہ پانی جو زندہ ہوتے ہیں اُنہوں نے اسے جنم دیا ہے اور اب میں اِسے پالوں گی۔ اُس کا نام ایک راہگیر نے رکھا تھا جو کہتا تھا کہ ہری یوپیا ایک بستی ہے جو پاروشنی دریا کے کنارے ہے اور چونکہ اسے

دریا نے جنم دیا ہے اس لئے اسے پاروشنی کہو۔ ماتی کی چھاتیوں میں اتنا دودھ تھا کہ تینوں پُتروں کو رُجھ پلانے کے بعد بھی پاروشنی کے جُسّے کو بڑا کرنے کے لئے بہت تھا۔ اور وُہ بڑی ہو گئی۔ اور جب وُہ اتنی بڑی ہو گئی کہ اپنا کام کاج خود کر سکے تو اُس نے اپنے ہاتھوں سے یہ گھر بنایا اور ماتی سے الگ ہو گئی۔ ایک ہی چھپر تلے چار جوان جُسّے سُکھ سے نہیں سو سکتے۔ اب وُہ بستی کا ایک اَنگ تھی جس کے ذمّے سویرے سویرے پانی بھرنا تھا اور اپنے حصّے کی زمین کھود کر اُس میں بیج ڈالنا تھا اور بڑے پانی کی راہ دیکھنا تھا۔ سب کی طرح۔ پر اس بار بات اور تھی۔ صِرف وُہ جانتی تھی کہ پانی آ رہے ہیں اور باقی لوگ راہ دیکھ رہے تھے۔

ہوؤ۔۔ دَھم۔۔ ہوؤ۔۔ دَھم۔

ورچن کے ماں باپ بھی کب کے رُکھوں کے اندر جا چکے تھے۔ اور اُس نے اُنہیں ایک بار دیکھا بھی تھا۔ اُنہیں تو نہیں پر اُن کے پنجروں کو۔ جب کوئی بوڑھا ہوتا تھا اور اُس کے ہاتھ پیر جواب دینے لگتے تھے تو جسے سُوجھ بُوجھ ہوتی تھی وُہ جان جاتا تھا کہ اب اُسے یہ بستی اور یہ سب کچھ چھوڑنا ہے۔ ان گنت دنوں اور راتوں کے بوجھ نے اُس کے جُسّے کو پھوک کر دیا ہے اور اُسے جانا ہے اور ایسے لوگ کسی رات اپنی سروٹ کی چٹائیوں سے اُٹھ کر چُپ چاپ رُکھوں میں چلے جاتے تھے اور پھر وُہیں رہ جاتے تھے۔ اور جو نہیں جاتے تھے یا جن کو یَم کُتّے ٹھنڈا کر دیتے تھے اُن کے لئے پکلی بڑے مرتبان بناتی تھی جن میں ڈال کر اُنہیں زمین میں رکھ دیا جاتا تھا۔ اور یُوں ورچن بھی پاروشنی جیسا تھا، نہ کوئی آگے اور نہ کوئی پیچھے۔

ہوؤ۔۔ دَھم۔ ہوؤ۔۔ دھم

اور سَمرو۔۔ وہ بھی ورچن تھا۔ اور ورچن سمرو تھا۔ اور دونوں کے ناموں سے وُہ گیلی ہوتی تھی۔

ہوؤ۔۔ دَھم۔۔ ہوؤ۔۔

اُسے یوں لگا جیسے باقی جو آدھے کنگن رہ گئے ہیں اُن کی کھنک بڑھتی جاتی ہے، اُس کے ماتھے پر لگتی ہے۔ اور شور بہت ہے۔

اُس کا سارا بدن پسینے میں نہاتا تھا اور جہاں وُہ کھڑی تھی اُس کے پاؤں سے پسینہ گرتا تھا اور زمین میں پیاسی زمین میں گم ہوتا تھا۔ جب بھی وُہ مونگلی کو نیچے لا کر کنک پر مارتی تو پسینے کے چھینٹے اُس کے بدن سے اُڑتے۔

اور شام گہری ہو چکی تھی۔

کنگنوں کی کھنک اب اُس کی برداشت سے باہر ہو رہی تھی۔ اُس نے مونگلی رکھ کر باقی کنگن بھی اُتار دیئے جو پسینے کی وجہ سے پھسلتے ہوئے آسانی سے اُتر گئے۔۔ اب کھنک ختم ہوئی۔ صرف ہوؤ۔۔ دَھم کی آواز تھی۔ اور کوئی شور نہ تھا۔ جو کچھ پہن لو، جتنا پہن لو اتنا زیادہ شور۔۔ کنگن بندھن ہیں جو بندہ آپو آپ پہنتا ہے، اپنی من مرضی سے۔۔ ایک کنگن ورچن ہے، دوسرا سمرو ہے، تیسرا وُہ چیزیں جو بدن مانگتا ہے، چوتھا اچھی فصل، پانچواں اُن چیزوں کی آس جن کے بغیر گزارہ ہو جاتا ہے پر جن کے لئے جی کرتا ہے۔۔۔ اور یہ سارے کنگن مل ملا کے بازو بھر دیتے ہیں اور بھار ہوتے ہیں اور کھنکتے رہتے ہیں اور شور کرتے ہیں۔

۔۔ جتنے کم ہوں گے شور بھی کم ہو گا۔۔ نہ ہوں گے تو سُکھ ہو گا شور نہ ہو گا۔۔ پر بندہ کون کون سا کنگن اُتارے؟

پاروشنی کا پسینے میں بھیگا ہوا سیاہ جُثہ بستی میں اُتری ہوئی شام میں بہت دیر تک دکھائی دیتا رہا۔

ہوؤ۔ دَھم۔۔ ہوؤ۔ دَھم۔ ہوؤ۔۔ دَھم۔۔

یہی وہ جگہ تھی جہاں وُہ بیٹھتی تھی۔

گاگری جُھک گئی۔ ریتلی زمین پر اُس کے پنجوں کے نشان تھے اور اُن کے بیچوں بیچ اِدھر اُدھر سفید سنہری مائل بیٹ تھی۔ وُہ یہیں واپس آئے گی۔ گاگری سیدھی ہوئی۔

پورا آسمان رُکا ہوا تھا اس لئے کہ اُس سارے میں کوئی شے بھی ہلتی ہوئی نظر نہیں آتی تھی بس خالی تھا اور رُکا ہوا تھا۔ گاگری نے ایک لمبا سانس کھینچا تو اُس کی ناک کا پوپا لرزنے لگا اور پھر اپنا چھوٹا سا سر گھٹنوں میں چُھپا کر جیسے آسمان کی طرح رُک گئی۔۔ اب اُسے اُڈیکنا تھا۔ اُس کے کانوں نے اُسے بتانا تھا کہ وُہ آگئی ہے۔ اُس کی گردن کے گرد کسی ہوئی ہَسّی اُس کے گھٹنوں کو لگی تو اُس نے اپنا ماتھا آگے کر کے گھٹنوں پر رکھ دیا۔

وُہ سویرے سے ہی بستی سے باہر ادھر چلی آئی تھی۔ اِدھر جہاں سے ڈوبو مٹّی شروع ہوتی تھی اور جہاں سے اِکا دُکا رُکھ دکھائی دیتے تھے۔ اُسے پہلے تو اُس جگہ کو تلاش کرنا تھا جہاں وُہ بیٹھتی تھی اور اُس کے پنجوں کے نشان اور بیٹ پڑی ملتی ہے اور پھر سانس روک کر بیٹھنا تھا تاکہ وُہ واپس آئے تو اُسے بھی کوئی جھاڑی سمجھ کر نیچے آنے سے نہ کترائے۔ یُوں تو سب لوگ کنک پھلیاں اور پھوگ کا ہی کھانا پینا کرتے تھے اور کبھی مچھلی کا ماس بھی کھا لیتے تھے لیکن اُن کے تالُو میں کبھی کبھار پرندوں کا سواد بھی پُھوٹتا تھا اور ساری بستی میں نِری گاگری تھی جو اُن کو قابو کرنا جانتی تھی۔ ویسے تو نت نئے رنگوں اور نسلوں کے پکھیرو اُن کے چھپروں کے آسمان پر سے اور دریا پر سے گزرتے رہتے تھے اور کبھی اُن میں سے کوئی تھکان سے نیچے آجاتا تو وُہ اُسے ڈھیمیں مار مار کر گرا لیتے۔ پر یہ تو کبھی کبھار ہی ہوتا اور جب کبھی اُن کے تالُو میں سَواد پُھوٹتا تو وُہ گاگری کا منِت ترلا کرتے کہ دیکھ جب پچھلا بڑا پانی آیا تھا تب تُو نے اُس کا ماس ہمیں کھلایا تھا۔ فصل پکنے پر ہم تجھے ایک ایک ٹوپی کنک دیں گے تو آج پھر اُس کا ماس کھلا دے۔ بستی میں اور بھی ایسی تھیں جن کے مجسّوں میں پُھرتی پھڑکتی تھی پر یہ صرف گاگری میں تھا کہ وہ ہاتھ

میں ڈنڈا لے کر جب پرندے کے پیچھے لپکتی تو وُہ اُڑان کرنا بُھول ڈنڈے کی چوٹ کھا پھڑ پھڑ اُس کے ہاتھوں میں آجاتا۔ گاگری نے کئی مرتبہ چاہا کہ کوئی دوسرا بھی یہ کام سیکھ لے پر کوئی نہ سیکھ پایا۔ ویسے اُسے پرندے کو مارتے ہوئے کچھ ہوتا تھا، شائد دُکھ ہوتا تھا۔

ہاں گاگری جنگل میں بے ڈرے جاتی تھی اور وہاں جو کچھ ملتا مار لیتی تھی پر کبھی کبھار پاروشنی وہاں کیا کرنے جاتی تھی؟

وُہ گھٹنوں میں سر دیئے سانس روکے، کان لگائے سُنتی تھی۔

وُہ، اُس کی بھین کو اَسی اور چھوٹا بھرا گُٹا بستی کے باقی لوگوں کی طرح کھیت کھود کر اُن کے گرد کچی دیواریں اُسار کر اب بڑے پانیوں کی آس میں تھے۔ اُس کی میّا میں اب زور نہیں تھا کہ کھیتوں میں جا کر جُھکے۔ وُہ شائد کسی رات آپو آپ رُکھوں میں جانے والی تھی لیکن آج اُس نے کہا تھا کہ گاگری بڑوں نے کہا ہے کہ اُڑنے والی ذات کے ماس میں گرمی ایسی ہوتی ہے کہ پُرانی اور جھڑتی ہڈیوں کو بھی جوڑ دیتی ہے، تو جا کر ہاتھ پاؤں مار خورے کچھ قابو میں آجائے۔ وُہ جب کبھی اس کام کے کرنے کو ادھر آتی تو کر کے جاتی، کبھی خالی ہاتھ نہ لوٹتی، اُس کی اُنگلیاں لکڑی کے موٹے ڈنڈے پر کسی مکوڑے کی طرح رینگیں۔

کواسی اُس سے بڑی تھی اور اُس میں آلکس بھی بڑی تھی۔ وہ اپنی چٹائی سے اُٹھتی تو پیٹ بھرنے کو یا خالی کرنے کو، نہیں تو ٹانگیں پھیلائے لیٹی رہتی اور گُٹا اُس کا جُثہ دباتے دباتے تنگ آجاتا۔ کواسی ایک دو بار بیاہی گئی پر زیادہ دیر نباہ نہ کر سکی اور مرد کو گھر سے باہر کر دیا۔ ادھر یہی ہوتا تھا مرد تو بیج ڈالنے والا تھا۔ اب یہ عورت کی مرضی کہ اُس کے ساتھ لیٹے یا نہ لیٹے اُسے کھانے کو دے یا نہ دے۔ کواسی کی آلکس سے تنگ آکر اب مرد اُس کے پاس سے گزرتے بھی نہیں تھے کہ کوئی کام کہہ دے گی۔ یُوں بھی شائد اُس کے اندر کچھ نہ تھا، جو ہوتا تو بیج پڑنے سے پھوٹتا۔ اب وہ چٹائی پر پاسے پلٹتی گھر میں رہتی۔ میّا کو پیاس لگتی تو اُٹھ کر پانی نہ دیتی، خود بھی بُھوکی پیاسی پڑی رہتی۔ گُٹا گاگری آتے تو اُن دونوں کا کچھ بندوبست کرتے۔

اور اب وُہ بستی والوں کے تالُو کے لئے اور میّا کی پُرانی ہڈیوں کے لئے گھٹنوں میں سر چھپائے کان لگائے سُنتی تھی۔

وُہ خود تو خالی نہیں تھی، اُس میں بیج پڑا، پھوٹا اور پھر ختم ہو گیا۔۔۔ اور کس کا بیج۔۔۔ وُہی جس کے اندر بس شک ہی شک ہے۔ جس میں آلکس تو ہے پر اُس کے سَر میں رَت یوں دوڑتی ہے کہ اُس کی بات سب سے الگ ہوتی ہے۔ نہ وُہ کھیت پر جائے نہ کوئی اور کام کرے چیوا

تو بس باتیں کرتا جائے سوجھ بُوجھ کی اور اچنبھے کی باتیں۔ بستی میں پانیوں کی بات ہو، کھیتی کی کوئی کہانی ہو، کوئی ایسی انہونی ہو جو کوئی بُوجھ نہ سکے تو سب یہی کہتے تھے کہ چیوا بات کرے گا اور وُہ کرتا اور سب کہتے کہ ٹھیک کرتا ہے۔ اُسی چیوا کا بیج اُس نے پالا، پر جب وُہ باہر آیا تو جہاں اُس کا ناک مُنہ ہونا چاہیئے تھا وہاں بھی ماس تھا۔ ناک مُنہ کی شکل ہی نہ تھی تو وہ سانس کہاں سے لیتا، مر گیا اور گاگری اُسے ایک چھوٹے سے برتن میں دبا آئی اور پتھروں کے راستے میں ایک چھوٹا سا پتھر بھی رکھ آئی۔ چیوا کے پاس وُہ اب بھی جاتی تھی پر جب جُسّہ تنگ کرنے پر آجاتا تھا تب۔

رُکے ہوئے آسمان کے ایک حصّے میں سرسراہٹ ہوئی جو اُس کے کانوں میں آئی۔ اور حرکت کی ایک آواز نیچے اُتری۔ اُس نے دھیرے سے گھٹنوں سے سر اُٹھایا اور سانس روکے اوپر دیکھا، بھوکڑ تھی۔

وُہ ایک لاپرواہ کیفیت کا آنکھوں میں اُتر جانے والا پرندہ تھا اور آسمان میں ٹوٹتے تارے کی طرح تیزی سے جیسے جلتا ہوا تیرتا تھا۔ اُس کے پھیلے ہوئے پروں پر سفید اور بُھورے دھبّے بھلے لگتے تھے اور گاگری جانتی تھی کہ اب وُہ اُس ریتلے ٹکڑے پر اُترے گی جہاں اُس کی سبزی مائل سفید بیٹ اور پنجوں کے نشان ہیں۔ تب تک اُسے، گاگری کو دم روکے بیٹھنا تھا۔ بھوکڑ کے بارے میں کہتے تھے کہ اس پرندے کو پکڑ کر صرف کھایا جا سکتا ہے اِسے پنجرے میں بند نہیں کیا جا سکتا وہاں یہ مر جاتا ہے، دانہ نہیں چگتا، پانی نہیں پیتا اور مر جاتا ہے۔ ہاں ایسا ہے کہ اُسے بند کرنے والا اگر اُس کی طرف پیٹھ کر لے، اُسے دیکھے نہ تو وُہ کھا لیتا ہے۔ وُہ نہیں چاہتا کہ اُس کی مجبوری کو اُسے بند کرنے والا دیکھے۔

بھوکڑ نے خالی آسمان میں دو تین چکّر لگائے اور پھر چونچ نیچی کر کے سیدھی زمین کو آنے لگی۔ گاگری نے کن اکھیوں سے اُسے دیکھا۔ وُہ نیچے آئی اور اُس نے اپنے پاؤں آگے کر دیئے جیسے اُن کی مدد سے اپنی اُڑان کو روکنا چاہتی ہو اور پھر پَر پھیلا کر زمین پر پنجے اس طرح رکھے جیسے رکھ نہ سکتی ہو اور اُن میں گہرے زخم ہوں اور اُن پر اپنا پُورا بوجھ نہ ڈال سکتی ہو۔ اُس نے اپنی بیٹ کو دیکھا اور پنجوں کے نشانوں کو دیکھا تو اُسے اطمینان ہوا اور وُہ پَر سمیٹ کر اطمینان سے بیٹھ گئی۔۔

بس یہی وُہ گھڑی تھی۔۔ گاگری کی مہین آنکھیں بھوکڑ پر جمی تھیں، اُس کی اُنگلیوں نے ڈنڈے کو بھینچا، اُس پر سخت ہوئیں اور پھر وُہ اپنے پنجوں سے زمین کو کُریدتے ہوئے یکدم اُٹھی اور بھوکڑ کی طرف لپکی۔ بھوکڑ نے قدموں کی دھمک سُنی تو سُن ہو کر رہ گئی اور پھر آنکھیں

جھپک کر اُڑان کرنے کی بجائے اندھا دھند دوڑنے لگی، گاگری اُس پر دھاوا بولنے کو تیار اُس کے پیچھے اُڑتی چلی گئی۔۔ بہت بھاری بھوکڑ ہے، ساری بستی کے حصّے میں اس کا ماس آئے گا، پکڑ گاگری، مار۔۔۔ وُہ ڈنڈا اٹھائے اُسے سر پر دے مارنے کو تیار لپکی چلی جا رہی تھی کہ بھوکڑ نے اپنی پیٹھ بھینچی اور پھر اُسے یکدم کھول کر بیٹ کی بوچھاڑ گاگری کی آنکھوں کی طرف دے ماری۔۔ اور وُہ اس کے لئے تیار تھی۔ وہ جانتی تھی کہ بھوکڑ اپنے بچاؤ کو یہی کرے گی اور اُس کی نظریں اُس کی پیٹھ پر تھیں اور جونہی وُہ بھینچی گئی اُس نے جان لیا کہ اب اُس میں سے زہریلی بیٹ نکلے گی اور اُس نے فوراً اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔۔ اور یوں بچاؤ ہو گیا تھا۔

اُسے ہر صورت اب اُس کے سر کے اوپر ہونا چاہئے تھا ورنہ وہ چند قدم اور دوڑنے کے بعد اُڑان کر جانے کو ہو گی۔ گاگری نے ہانپتے ہوئے سانس اندر کھینچا اور دانت پیستے ہوئے پُورے زور سے بھاگتی اُس کے سر پر جا پہنچی اور اُسی وقت اُس نے پر کھولے اور اُڑان کے لئے اونچی ہونے لگی اور اُسی وقت گاگری نے ڈنڈا ہوا میں بلند کیا۔ بھوکڑ کی گردن ڈنڈے کے عین نیچے تھی۔ وُہ بدن کے زور کو ڈنڈے میں لائی اور اُسے نیچے اُس کے سر پر لانے کو تھی کہ۔۔ بھوکڑ رُکے ہوئے آسمان میں تیزی سے تیرتی تھی ایک ٹوٹتے تارے کی طرح۔۔۔

گاگری ہانپتی ہوئی وہیں گر پڑی اور اُس کے پسینے سے نچڑتے جسم پر مٹّی چمٹ چمٹ کر کیچڑ ہونے لگی۔۔ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا، اس بار ایسا کیونکر ہوا، اُسے پتہ نہیں تھا۔ جب ڈنڈا بھوکڑ کے سر پر تھا اور وُہ اپنے پروں کو سمیٹتی اپنے آپ کو بچانے کو بھاگتی تھی تب شائد اُس کے بھاگنے میں کچھ تھا جو گاگری کے اندر گیا اور وہاں دُہائی دی کہ مت مارو۔۔ مت مارو۔۔ اور اُس نے جان بُوجھ کر ہاتھ روک لیا تھا۔ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ وہ چھاتیوں پر لیڑا نہیں باندھتی تھی کہ وہ بہت چھوٹی اور سینے کے ساتھ لگی ہوئی تھیں سو اُس نے اپنی لنگی اُتاری اور اپنے جُثّے کو پسینے اور کیچڑ سے صاف کیا۔ لنگی باندھ کر وُہ پھر کھڑی ہو گئی۔ تھوڑی دُور ڈوبو مٹّی کے بیچ میں پندرو اپنی دُم جھاڑتا آنکھیں جھپکتا تھا اور اُس کا مٹیالا سُنہری رنگ سویر کی ہلکی روشنی میں نتھرا ہوا تھا اور وُہ جانتا تھا کہ ابھی ابھی جو عورت زمین پر پڑی ہونکتی تھی پاروشنی نہیں گاگری تھی جو جنوروں اور پکھیروؤں کی بیری تھی اور وُہ اس تک نہیں پہنچ سکتی تھی کیونکہ اُن دونوں کے بیچ ڈوبو مٹّی تھی اور یہ جانتے ہوئے وہ لاپروائی سے دُم کو زیادہ زور سے جھاڑتا تھا اور آنکھیں جھپکتا تھا۔ اور پھر تھوڑی دیر بعد اُس نے تھوتھنی اوپر کر کے تتھنے پھلائے جیسے ہوا سونگھتا ہو اور ہوا میں کچھ ہو اُس نے ٹانگوں کو جھٹکا اور پھر پلانگیں بھرتا رُکھوں کے اندر چلا گیا۔ جونہی پندرو نے

تھوتھنی اُٹھا کر ہوا میں کچھ سونگھا تھا گاگری کے تتھنے بھی پھڑپھڑائے تھے کہ ہوا میں کچھ ہے۔ پھر اُس نے اپنے بازوؤں پر پُھوٹتے پسینے پر ہاتھ پھیرا تو اُس پر اُنگلیاں پھسلتی تھیں، اُس میں چکنائی تھی۔۔ پانی برسے گا۔ گاگری نے آسمان دیکھا جو بھوکڑ کے جانے کے بعد اب پھر پُرکا ہوا تھا۔ اُس نے ہوا کو اپنے اندر کھینچ کر روکے رکھا کہ شائد کچھ پتہ چلے کہ کیا ہو گا۔۔ پر وہاں کچھ نہ تھا۔۔ نہیں جُنے میں سے چکناہٹ پُھوٹے تو پانی ضرور گرتا ہے، مینہ دُور نہیں ہوتا۔

گاگری پسینہ پونچھتی، کبھی آسمان کو دیکھتی اور اپنے گلے کی ہنسی پر ہاتھ پھیرتی بستی کو چلنے لگی۔ اس کے ڈنڈے کا بھار بہت ہو رہا تھا پر وُہ اُسے اٹھائے ہوئے تھی ایسے کہ اُس کے بغیر جیسے وُہ پُوری نہ ہو۔ اُس کی اُنگلیاں اُس کی گولائی پر تنگ ہوتی تھیں، پھیلتی تھیں اور پھر تنگ ہوتی تھیں اور گاگری کی آنکھیں اُن کے ساتھ بند ہوتی جاتی تھیں اور وُہ اُس کے بوجھ کو اٹھائے اُس کی گولائی محسوس کرتی ہانپتی چلتی تھی۔ اُس کے ایک طرف رتّے ٹبّے تھے جن پر پھوگ اور لانا کی جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ ٹیلے سدا وُہیں رہتے تھے جہاں وہ اب تھے، وہاں سے کہیں نہیں جاتے تھے اور دوسری طرف ککّے ٹبّے تھے جن پر کچھ نہ اُگتا تھا کیونکہ یہ اُگنے یا پھوٹنے سے پہلے ادھر ادھر جگہ بدلتے رہتے تھے بھکشو ٹیلے کی طرح۔۔ ان ٹبّوں میں کہیں کہیں پرم ڈنڈی۔ کترن۔ گورکھ پان اور چھپری وغیرہ کی بوٹیاں نظر آتی تھیں۔ چھپری کی سفیدی مائل سبز بُوٹی کا بیج ناک میں پہننے والے پوپے کی شکل کا ہوتا ہے اور اپنے اندر اتنی گرمی اور زور رکھتا ہے کہ مرد اُسے کھا کر پھر سو نہیں سکتا۔ گاگری نے اپنے ڈنڈے پر گرفت مضبوط کی اور چھپری کی بُوٹی کو دیکھ دیکھ کچھ مسکرائی اور چلتی رہی۔ اُس کے مُنہ میں پیاس خشک ہونے لگی، وُہ کترن کی بوٹی کے پاس رُکی اور اُس کے نیچے زمین کو کھود کر اُس کی ایک جڑ نکال لی۔ جڑ کو صاف کر کے اُس نے اُسے مُنہ میں رکھا تو جیسے پیاس کم ہونے لگی اور وُہ اُسے چباتی چلتی رہی۔

پاروشنی نے چٹائی پر لیٹے لیٹے اپنا بازو ہوا میں اوپر کیا تو اُس کے کنگن ایک ہلکے شور کے ساتھ اُس کی کُہنی پر گرے۔ کونسا کنگن فالتو ہے؟۔ اُس کی چھاتیوں کے درمیان جہاں وُہ مل کر ایک ہوتی تھیں وہاں پسینہ اُنہیں بھگوتا تھا۔ پاروشنی نے اُنہیں ہاتھ سے پونچھا اور اُس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہاں پسینے میں چکناہٹ کا شُبہ تھا۔ پانی۔ بڑے پانی تو آ رہے ہیں، اُسے معلوم تھا لیکن کیا وہ آسمان سے بھی اُتریں گے۔۔ اگر ایسا ہوا تو سب سُوکھا اور خُشک و تر میں آ

جائے گا اور اُس وتر میں جو کچھ ہو گا پھوٹ پڑے گا۔ ورچن بھی وتر تھا۔ اُس کے بیچ کچھ گرم ہوا اور پھر بہا۔

ہر پاسے دن رات کا عجب چکّر ہے۔ نہ کوئی شے جاتی ہے نہ آتی ہے۔ جو ہوتی ہے وُہی رہتی ہے یا اُس کی جگہ پر اُسی طرح کی کوئی اور آ جاتی ہے۔ رُکھوں میں مور ہیں، ہرن اور سیہے ہیں اور بھینسیں ہیں اور ہمیش سے ہیں۔ ادھر بستی میں ہم سب ہیں اور زمانے سے ہیں۔ ایک جاتا ہے تو دوسرا آ جاتا ہے۔ حیاتی کا یہ چکر کہاں سے چلا یہ پتہ نہیں پر یہ پتہ ہے کہ یہ ختم نہیں ہو گا، بیج اُسے آگے آگے لیے جاتا ہے۔ دریا کے پانی بھی ہمیش اتنے ہی رہتے ہیں، ختم نہیں ہوتے، کم ہو جاتے ہیں اور پھر اتنے ہی ہو جاتے ہیں تو پھر حیاتی تو ہمیش کی ہوئی یہ مٹّی تو نہیں ہوتی۔ رہتی ہے وُہیں پر۔ اور پانیوں میں بسنے والے بھی اتنے ہی رہتے ہیں، مچھلیاں، کچھو، مگر مچھ اور دُوسرے۔ مچھلیاں جو پکلی اپنے گھڑوں اور جھجھروں پر اُلیکتی ہے اور مگر مچھ جو میں سمرو انہی مُہروں پر بناتا ہوں۔ میں بناتا ہوں یا وُہ جنور خود بنتے ہیں؟ میں اگر نہ ہوں تو بھی بنتے جائیں گے۔۔

اور یہ بڑا پتھر جو گھاگرا کے کنارے پر ریت کے اندر پتہ نہیں کہاں تک دھنسا ہوا ہے اِسے میں تب سے توڑتا آیا ہوں جب سے میرا باوا اتنا تھا جتنا میں اب ہوں اور تب میں دو ہاتھ اونچا تھا۔ اور اُس سے پہلے اُس کا باوا تھا جو اُسے لے کر یہاں آتا تھا۔ وُہ مجھے یہاں لا کر پانی کے پاس بٹھا دیتا اور پھر بانس پر سلمکی رسّی سے بندھے ہوئے سخت پتھر کو اس ریت کے اندر ہی اندر پھیلی چٹان پر مارنے لگتا۔ میں، سمرو پانی میں پاؤں ڈالے بیٹھا رہتا اور وُہ اپنے بازو کا زور اپنے ہاتھ میں پکڑے بانس والے پتھر میں ڈال کر چٹان کو توڑنے میں لگا رہتا۔ اس چٹان کو جسے میں اب توڑ رہا ہوں اور کل کوئی اور سمرو توڑے گا۔ پر میرا تو آگے ابھی کوئی نہیں تو اِسے کل کون توڑے گا۔ میں جو منکے مُہریں اپنے باوا سے سیکھا ہوں دیکھ دیکھ کر تو مجھے اب دیکھنے والا کوئی نہیں تو کل اِنہیں کون بنائے گا۔ نہیں بنائے گا تو۔۔۔ چٹان کے گرم جسّے میں ایک باریک دراڑ پھیلی جسے سمرو نے اپنا پتھر مار مار کر بڑا کیا اور پھر چٹان سے ایک بڑا ٹکڑا الگ ہو کر اُس کے پاؤں پر آ گرا۔۔ سمرو کے دانت پاؤں کی چوٹ سے بھنچے پر وہ خوش تھا۔ بس ایک اور ٹکڑا۔ تب میں بہت سارے دنوں تک بڑے سُکھ سے اُنہیں کاٹ کاٹ کر اور بنا کر اُن میں سے منکے اور گھنے گھڑتا رہوں گا۔۔ آس پاس رُکھوں میں یا اُن کے پار کہیں بھی کوئی چٹان نہ تھی، صرف یہاں

دریا کے ساتھ ریت کے اندر یہ پھیلی ہوئی تھی شائد صرف سمرو کے لئے۔ پہلے سمرو کے لئے جس نے اِسے پہلی بار دیکھا اور آخری سمرو کے لئے جسے شائد وہ دیکھے گی۔ ان دنوں سمرو کے پاس بہت لوگ آتے تھے۔ بستی والے جب مینج ڈال کر ہاتھ بالکل خالی کر کے بیٹھ رہتے تھے تو پھر اُن کا جی ادھر کو آنے کو کرتا تھا اور وُہ سارا سارا دن سمرو کے چھپر تلے بیٹھے رہتے تھے اور اپنی من مرضی کی مہریں اور منکے بنواتے تھے، انہیں گلے میں ڈالتے تھے یا بازو پر باندھتے تھے۔ بازو پر باندھنے کے لئے ہر کوئی مگر مچھ والی مُہر پر سر ہلاتا تھا۔

سمرو کی پیٹھ پسینے سے بھیگتی تھی اور وہ چٹان میں سے اپنا حصّہ توڑنے کو زور لگاتا تھا۔

اس وقت پُورا جُثہ بھیگ رہا ہے، پر پسینہ ہے زور لگتا ہے تو بھیگتا ہے۔ پر یہ رات کو سوتے میں کیوں بھیگتا ہے؟ میں رات کو کہاں جاتا ہوں اور کیا دیکھتا ہوں کہ میرے لیڑے اور میری چٹائی اُٹھتا ہوں، جاگتا ہوں تو ایسے جیسے دریا مُجھ پر سے گزر کر واپس گیا ہو۔ میں کہاں ہوتا ہوں اور کیا دیکھتا ہوں؟ اور کبھی جو یاد رہے تو پاروشنی کو بتا دیتا ہوں۔ ساری بستی جب نیند میں اُترتی ہے تو کہیں اور جاتی ہے اور دریا پار جاتی ہے اور میں پتہ نہیں ادھر ہی رہ جاتا ہوں جو آنکھیں بند ہونے پر بھی دیکھتا ہوں۔

سمرو کی بھیگی ہوئی پُشت پر ہوا نے ہاتھ رکھا اور اس میں ٹھنڈک تھی۔

یہ ٹھنڈک کچھ زیادہ ہے، سمرو چٹان پر جھکا ہوا تھا اور اُس کے سر میں یہ بات آئی کہ ٹھنڈک کُچھ زیادہ ہے۔ وُہ سیدھا ہوا تو اُس کے پاؤں تلے کی ریت میں نمی تھی اور اور۔۔ دریا آگے آیا ہوا تھا۔ سمرو کی آنکھیں پھیل گئیں۔ بڑے پانی؟۔ بس اسی لئے۔۔ بس اسی لئے۔۔ آج دریا کنارے کی سُوکھی ریت اتنی گرم نہیں تھی۔ اُس میں نمی تھی اسی لئے۔۔ اور جو ہوا ٹھنڈی ہو رہی تھی تو اسی لئے کہ دریا پھیل رہا تھا اور وُہ اُس پھیلاؤ پر ہو کر آتی تھی۔ بڑے پانی، انہیں تو آنا ہی تھا۔ اُس نے اپنا بانس اور پتھر ایک طرف رکھا اور جلدی سے چٹان مین سے توڑے ہوئے دو تین بڑے ٹکڑے گھسیٹ کر اُدھر لے گیا جہاں ابھی خشکی تھی اور جدھر پانی نے آنا تو تھا پر ابھی ٹھہر کے۔ وہ واپس آیا اور چٹان کے قریب کھڑے ہو کر اُس نے اپنا زور اور اپنی اُمید آنکھوں میں بھر کر دیکھا۔ ہاں دریا چڑھ رہا تھا۔ اُس پر جھاگ تیرتی تھی اور بڑا پانی آ رہا تھا۔ اُس کے دیکھتے دیکھتے پانی اُس کے پاؤں میں آیا اور پھر آگے آگے ہوتا گیا۔ تب اُسے وُہ بُوٹا یاد آیا جو کل شام پاروشنی کے ہاتھ میں تھا اور وُہ اُسے چُھپاتی تھی اور کہتی تھی کہ یہ دریائی بُوٹا نہیں ہے۔ اسی لئے۔ وہ جانتی تھی۔ کہ پانی آ رہے ہیں اور بتاتی نہیں تھی کیونکہ وُہ بتا نہیں سکتی تھی ورنہ یہ واپس